فسطائیت اور اس کی ستم رانیاں

پروفیسر عبدالحمید صدّیقی۔ ایم اے

دنیائے انسانیت کو جب وہ امن و اطمینان، جس کے سنہرے خواب وہ تہذیبِ الحاد کے سائے میں دیکھ رہی تھی، نہ سرمایہ دارانہ جمہوریت سے ملا، نہ اشتراکیت کی تحریک سے، تو ایک تیسری تحریک اسی تہذیب کے بطن سے نمودار ہوئی، جسے عام طور پر فاشزم یا فسطائیت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ تحریک بظاہر سرمایہ دارانہ جمہوریت اور سوشلزم کے مجموعی ردِ عمل کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے، مگر گہری نظر سے اس کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ حقیقت از خود منکشف ہو جاتی ہے کہ یہ اپنے مزاج اور اساسی تصورات کے اعتبار سے بالکل اپنے پیشتر توام بھائیوں سے ملتی جلتی ہے۔ ان کی پھیلائی ہوئی بدعتیں بدلے ہوئے ناموں سے اس میں موجود ہیں۔

مغربی انسان کی یہ سب سے بڑی بدقسمتی ہے کہ الحاد اُس کی فطرت میں داخل ہو چکا ہے۔ جس طرح کوئی شخص اپنی فطرت سے باہر نہیں جا سکتا، اس کی حدود و قیود نہیں توڑ سکتا، اسی طرح یورپ کے زرخیز دماغ الحاد کو جو کئی سو سالوں سے اُن میں جاگزیں ہے نہیں چھوڑ سکتے۔ اُن کے دلوں میں مختلف نظاموں کے متعلق برابر شکوک و شبہات پیدا ہوتے رہتے ہیں، وہ نئی نئی تحقیقات سے ان کی کمزوریوں کو دور کرنے کے لیے بھی برابر جدوجہد کرتے ہیں مگر نظامِ فکر کا جو ڈھانچہ بھی، وہ تعمیر کرتے ہیں اُس میں الحاد ایک بنیادی عنصر کی حیثیت سے شامل ہو جاتا ہے۔ اُن کی حالت ققنس کی سی ہے، جو آخری عمر کو پہنچ کر اپنے گھونسلے میں آگ لگا کر جل مرتا ہے، مگر پھر راکھ میں سے وہی پہلی قسم کی زندگی پیدا کرتا ہے۔ مغربی مفکرین بھی غور و فکر، تلاش و جستجو کے بعد اپنے افکار کے آشیانوں کو اپنے ہی نغمہ ہائے آتشیں سے پھونک ڈالتے ہیں، مگر پھر ان کی خاکستر سے ویسی ہی زندگی پیدا کرتے ہیں، جس کی تلخیوں نے انہیں آشیاں سوزی پر مجبور کیا تھا۔ یہی وجہ ہے

کہ جن مفاسد سے بچنے کے لیے وہ نظامِ حیات کا ڈھانچہ بدلتے ہیں وہی برائیاں تبدیل شدہ شکل میں اُن کے سامنے جلد ہی رونما ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔

سرمایہ داری، اشتراکیت، اور فسطائیت ایک ہی سلسلہ کی تین کڑیاں ہیں۔ جن برائیوں سے انسانیت کو محفوظ کرنے کے لیے یورپی مفکرین نے ایک طرف آزاد معیشت، اور دوسری طرف اشتراکی جکڑ بندیوں سے بچ نکلنے کا اہتمام کیا۔ اور اسی اہتمام کے تحت فسطائیت کی راہ اہلِ یورپ کو سجھائی، وہ ساری برائیاں خود فسطائیت میں بھی اُبھر کے رہیں۔ انسانیت کا قافلہ اس نئی شاہراہ پر ابھی چند قدم بھی چلنے نہ پایا تھا کہ ایسا معلوم ہوگیا کہ وہ بربریت کے ایسے مہیب غاروں کی طرف لڑھک رہا ہے جہاں صلح، امن، اور سلامتی بالکل مفقود ہیں اور جہاں قانون، اخلاق، انصاف بالکل بے معنی الفاظ ہیں۔ اور جہاں نظم و اتحاد کی بجائے افتراق و تباہی کی فرمانروائی ہے۔ فاشزم کا یہ عظیم الشان درخت جس سرعت کے ساتھ بلند ہوا جس برق رفتاری کے ساتھ اس کی شاخیں سارے عالم میں پھیلیں وہ سطح بین آنکھوں کو متحیر کرنے کے لیے کافی ہے مگر بارآور ہونے کے بعد جب انسانیت نے اس کے پھلوں کو چکھا تو اس وقت یہ حقیقت اس پر آشکارا ہوئی کہ اس کے ثمرات صرف تلخ ہی نہیں بلکہ جان لیوا بھی ہیں۔

فاشزم کے متعلق یہ حقیقت نظر انداز نہ کرنی چاہیے کہ یہ ان مخصوص نظاموں کے کسی ڈھانچے کا نام نہیں جو ہٹلر نے جرمنی میں یا مسولینی نے اٹلی میں قائم کیے۔ بلکہ فسطائیت کے کچھ اساسی تصورات ہیں۔ اس کے کچھ واضح اور بنے بندھے اصول ہیں، اس کا اپنا ایک نظامِ عمل ہے۔ ان کو نظر انداز کر کے فاشزم کا کوئی ڈھانچہ تعمیر نہیں کیا جا سکتا۔ یورپ کی مختلف فسطائی جماعتوں کے پروگرام خواہ بظاہر ایک دوسرے سے کتنے الگ اور بعض اوقات مختلف ہی کیوں نہ ہوں، مگر غور سے دیکھنے کے بعد یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ ان کی تہ میں ایک ہی محرک، ایک ہی زاویۂ نگاہ اور ایک ہی طرزِ فکر کارفرما ہے۔ فاشزم کو خواہ جرمنی اور اٹلی میں فرمانروائی کا موقع ملے، یا اس کا علم جنوبی امریکہ، ترکی، یوگوسلاویہ، رومانیہ، بلغاریہ، ہنگری، پولینڈ یا کسی دوسرے ملک میں بلند ہو۔ یہ نظام اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک ہی ہوگا اور اس سے ان ممالک میں ایک ہی طرح کے نتائج برآمد ہونگے۔ ہٹلر اور مسولینی دونوں

نے اس بات کو صرف محسوس اور تسلیم کیا، بلکہ انہوں نے اسے پوری شد و مد کے ساتھ دنیا میں پیش بھی کیا ذیل میں ہم فاشزم کے ان دو بڑے علمبرداروں کے چند اقتباسات درج کرتے ہیں تاکہ ان کے بنیادی تصورات کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ اس سلسلہ میں مسولینی کا ارشاد یہ ہے:۔

"فسطائیت فکر بھی ہے اور عمل بھی۔ یہ تحریک بعض خاص قسم کے اداروں کو تخلیق کرنے کے لیے معرضِ وجود میں نہیں آئی، بلکہ یہ انسان کی روحانی زندگی کی معلم بھی ہے۔ یہ اس کی داخلی اور خارجی زندگی کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھالنے کا عزم رکھتی ہے، اس کے پیشِ نظر انسان، اس کے اخلاق اور اعتقادات کو بدلنا ہے۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے یہ قوت کے استعمال کو بالکل جائز سمجھتی ہے۔ یہ انسان کی روح میں داخل ہو کر اس پہ بلا شرکتِ غیرے فرمانروائی کرتی ہے۔"

اسی طرح وہ اس فکری تحریک کے عالمگیر پروگرام کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے[1]:۔

"فاشزم ایک تصور، ایک عقیدہ اور ایک آفاقی تحریک ہے۔ ممکن ہے کہ یہ اپنے اداروں کی ہیئت کے نقطۂ نظر سے اطالوی معلوم ہو، مگر روح کے اعتبار سے عالمگیر ہے۔ اس کے علاوہ آخر اس کا مزاج ہو بھی کیا سکتا ہے۔"

ہٹلر نے بھی قریب قریب اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

"قومی اشتمالیت ایک ایسا عقیدہ ہے جو خون، رنگ، نسل اور شخصیت کی اہمیت کو ابھارتا ہے اور انتخابِ طبیعی کے ابدی قوانین کی اثر آفرینی کو واضح کرتا ہے۔"

فاشزم پر کسی قسم کی تفصیلی گفتگو کرنے سے پیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان مفکرین کی نشان دہی کریں جن کے خیالات نے اس تحریک کو جنم دیا۔ اس سلسلہ میں جو بات ذرا کھل کر ہمارے سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ میکیاولی، شوپن ہار، نیٹشے، رینان، نیلتی، جارج سورل، ولیم جیمز، برگسان، ہابز اور لاک کے خیالات نے اسے جنم دیا، اور لوتھر، کانٹ، ہیگل، فشٹے، فریڈرک لسٹ کے تصورات نے اسے قومی اشتمالیت (NATIONAL SOCIALISM) کا جامہ پہنایا، اور ہٹلر اور مسولینی کی بے پناہ قوت اور بندیہ تے

[1] FASCISM & NATIONAL SOCIALISM BY MICHAEL T. FLORINSKY.

اسے دنیا میں سربلندی عطا کی۔

اس تحریک کی بنیاد جن تصورات پر رکھی گئی ہے، اُن میں سب سے زیادہ اہم ریاست کی ہمہ گیری کا دعویٰ ہے۔ مسولینی اس کی اہمیت پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"زندگی کے فسطائی تصور میں ریاست کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ ایک فرد کے وجود کو اُسی حد تک تسلیم کرتا ہے جب تک کہ اُس کا مفاد ریاست کے مفاد سے ہم آہنگ ہو۔ ہمارے اس نظام فکر میں ریاست ہمہ گیر ہے۔ اس سے ہٹ کر نہ تو کسی انسانی یا روحانی تصور کو مانا جاسکتا ہے اور نہ ہی اُس کی کوئی قدر و قیمت ہے۔ جو کچھ بھی دنیا میں موجود ہے وہ ریاست میں ہے، اس سے باہر یا اس کے خلاف دنیا میں کسی دوسری چیز کا وجود نہیں"

اس طرز خیال کا آغاز نہ معلوم کس دور میں ہوا، مگر اسے علمی حیثیت سے ہابز نے پیش کیا۔ اُس کا گمان یہ تھا کہ مملکتی زندگی کے قیام سے پہلے جب انسان حالت فطری میں زندگی بسر کر رہا تھا تو اس کی یہ زندگی اس درجہ غیر محفوظ، انتشار انگیز اور وحشت افزا تھی کہ وہ اپنی بقا، اور امن و عافیت کے لیے یہ سودا کرنے پر مجبور ہو گیا کہ اپنی جان کو بچانے کے لیے وہ نہایت ہی خوش دلی سے اپنی آزادی اور اپنے اختیارات کو ایک فرمانروا کے سپرد کر دے، اور اس کی غیر مشروط اطاعت بجا لائے۔ ایک خود مختار فرمانروا کے سامنے سربسجود ہو جانے کے بعد، اب کسی شخص کا یہ حق نہیں کہ وہ اُس پر کسی قسم کا اعتراض کرے، یا اس کے کسی حکم کی خلاف ورزی کرے۔

تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ لاک (LOCKE) نے بھی یہی نظریہ پیش کیا، البتہ اس نے اس بات پر زور دیا کہ یہ معاہدہ جہاں ایک طرف افراد کے مابین طے پاتا ہے، تو دوسری طرف فرد اور فرمانروا کے روابط کو بھی متعین کرتا ہے، یعنی فرمانروا اس معاہدہ کا ایک فریق ہے اور اس کی اطاعت فرمانروائی اس شرط پر مبنی ہے کہ وہ امن قائم کرے۔

روسو نے معاہدہ عمرانی کے نظریہ کو ایک اور شکل میں پیش کیا۔ وہ حالتِ فطری کو انسان کی مثالی حالت تصور کرتا ہے۔ اُس کا خیال یہ ہے کہ انسان نے اپنی زندگی کا یہ فطری انداز ترک کر کے مملکتی زندگی

کا قلادہ اس وجہ سے نہیں پہنا کہ وہ امن و عافیت سے محروم تھا۔ بلکہ آزادی کے بدلے غلامی کو اختیار کرنے کا اصل سبب یہ تھا کہ ابن آدم اپنی فطری کمزوریوں کے باعث اس پرمسرت اور پُرامن زندگی کو دیر تک قائم نہ رکھ سکا اور مملکت کے قیام پر مجبور ہوا۔ روسو کے نزدیک معاہدہ عمرانی افراد کے مابین طے پاتا ہے جس کے ذریعہ سب افراد اپنی آزادیوں کو ارادہ عامہ (GENERAL WILL) کے تابع کر دیتے ہیں۔ اس نظریہ کے مطابق فرمانروا خواہ وہ ایک فرد ہو یا کوئی ادارہ، وہ اسی ارادۂ عامہ کا مظہر ہوتا ہے۔

اس ضمن میں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ یہ ارادۂ عامہ اکثریت کی رائے یا تمام افراد کی رائے سے بالکل ایک مختلف چیز ہے۔ اس میں کچھ آسمانی خصوصیات شامل ہو کر اسے بالکل منزہ عن الخطا بنا دیتی ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس "ارادۂ عامہ" کو سمجھنے کا کسے استحقاق ہے۔ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ ایک فرمانروا ہی اس کی اہلیت رکھتا ہے، وہی اس قابل ہے کہ اپنی ذہانت وطباعی سے "ارادۂ عامہ" کے "خاموش اشاروں" کو جان کر عوام کو نہ صرف اُن سے مطلع کرے بلکہ انہیں قوت کے ساتھ ان کا پابند بھی بنائے کیونکہ کسی فرد یا سوسائٹی کا جو فکر و عمل بھی اس سے ہٹ کر ہوگا وہ یقیناً گمراہی کی طرف لے جائے گا۔ دوسرے الفاظ میں آپ اس نظریہ کو یوں سمجھیے کہ ایک فرمانروا ہی صحیح بات کہنے کا مجاز ہے، افراد کا فرض صرف اسی قدر ہے کہ وہ بالکل آنکھیں بند کرکے اس کے احکام کو مانتے چلے جائیں۔ وہ انسانوں کے اس بے زبان گلہ کو جسے سماج یا سوسائٹی کہا جاتا ہے، میکانکی طور پر اپنے قوت و اقتدار سے جدھر چاہے ہانکتا پھرے۔ دنیا کی کسی قوت کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس کے "الہامی پروگرام" میں دخیل ہو۔

پھر فرمانروا کے اس سارے غیر معقول طرزِ عمل کو جو سراسر باطل افکار پر مبنی ہے، ریاست کے مفادِ عمومی کے نام پر جائز اور برحق قرار دیا جاتا ہے۔ انسان کے ذہن میں سب سے پہلے اس غلط تصور کو بٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ "فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں" اس لیے ہر وہ چیز جو ربطِ ملت میں حائل ہو وہ سراسر باطل ہے۔ لہٰذا ریاست کے سارے بہی خواہوں کا فرض ہے کہ وہ ہر قیمت

پر اس کا استیصال کریں۔ ایک انسان کی حیثیت سماج کے نامیہ میں ایک خلیہ (CELL) کی سی ہے۔ ریاست کی غیر مشروط خدمت اور چاکری میں ہی اس کی آزادی ہے۔ جو شخص اپنے رجحانات کو ریاست کے طرزِ عمل کے مطابق نہیں ڈھالتا وہ ملک وملت کا دشمن ہے اور اسے جتنی جلدی دنیا سے ختم کر دیا جائے اتنا ہی بہتر ہے۔ ایک فرد کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد یہی ہونا چاہیئے کہ وہ مملکت کی خاطر اپنے آپ کو بالکل مٹا ڈالے، اپنی تمام خواہشوں، آرزوؤں اور عزائم کو اس کی مشیت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دے۔ اس کا جینا اور مرنا اسی کی خاطر ہو، اُس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اسی کے لیے وقف ہو، وہ اگر مانگے تو اسی سے مانگے، اور جھکے تو اسی کے آگے جھکے۔

اس تصور کی رو سے مملکت کسی دوسرے مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں، بلکہ مقصود بالذات ہے۔ یہ محض اعتباری اور مجازی طور پر مقتدر نہیں، بلکہ اس میں الوہیت کی صفات بھی موجود ہیں۔ لہٰذا انسان کی نہ صرف مادی فلاح اس کی اطاعت کیشی پر منحصر ہے، بلکہ اُس کی روحانی سربلندی بھی اُس کی پرستش سے وابستہ ہے۔

مملکت کو ازلی اور ابدی اور واجب بالذات قرار دینے کا لازمی نتیجہ ہے کہ اُسے نہ صرف ہر قسم کی قیود سے آزاد سمجھا جائے بلکہ یہ بھی تسلیم کیا جائے کہ تمام قسم کی اخلاقی اور معاشرتی پابندیاں عائد کرنے کا غیر محدود حق اسے ــــ اور تنہا اسے ــــ حاصل ہے۔ تمام اصول اور قوانین کا واحد سرچشمہ صرف وہی ہے۔ وہ جن جن طریقوں سے بھی اپنے بقاء واستحکام کے لیے کوشش کرے وہ جائز اور مبنی برانصاف ہیں۔ ان پر کسی قسم کی حرف گیری نہ ہونی چاہیے بلکہ عوام کو انہیں ہی راستی اور عدل کا اصل معیار سمجھنا چاہیئے اس لحاظ سے مذہب واخلاق سے اگر یہ مقاصد حاصل ہوں تو انہیں اختیار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن اگر یہ اس راستے میں مزاحم ہوں، تو انہیں یکسر چھوڑ دینا چاہیے۔

ہیگل نے اپنی کتاب فلسفۂ تاریخ میں ان افکار کو بڑی صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"ریاست اس سرزمین پر ایک الہامی تصور ہے، ایک فرد میں جو صلاحیت بھی پائی جاتی ہے اُس کی جو قدر وقیمت بھی ہے وہ صرف اسی کی وجہ سے ہے۔ ریاست مقصود بالذات ہے

اسی کا حق سب پر فوقیت رکھتا ہے۔ ایک فرد کا سب سے اولین اور بڑا فرض ریاست کی رکنیت اختیار کرنا ہے۔"

مسولینی نے اسی نظریہ کی تائید میں کہا ہے :-

"فاشزم ریاست کو افراد اور گروہوں کے مقابلہ میں بالکل مطلق العنان تصور کرتا ہے۔ فطائی ریاست ارادہ اور اختیار رکھنے والی ایک باشعور شخصیت ہے۔ اسے ایک اخلاقی ریاست سمجھنا چاہیے جو اپنے اندر اخلاقی اور روحانی پہلو بھی رکھتی ہے۔

قومی ریاست کا یہ نظریاتی ارتقاء جہاں چند اصحابِ فکر کی ذہنی کاوشوں کا نتیجہ ہے وہاں یہ چند تاریخی واقعات کا رہینِ منت بھی ہے۔ فرانسیسی انقلاب کے بعد جب نپولین کی شہنشاہیت قائم ہوئی اور فرانسیسی فوجیں یورپ کی سرزمین پر سیلاب کی موجوں کی طرح پھیل گئیں تو اس "سیلِ بے پناہ" کو روکنے کے لیے مختلف اقوام کے اندر ایک جذبہ بیدار ہوا جس سے سیاسی دنیا اس وقت تک ناآشنا تھی۔ یہ قومیت کا جذبہ تھا۔ جب غیرت و حمیت نے اس پر تازیانہ کا کام کیا تو اس نے سیاسی نظریات و افکار میں ایک عظیم انقلاب پیدا کر دیا۔ ریاست اب تک ایک تصور تھی جسے اصولاً چاہے جتنی اہمیت دی جاتی ہو مگر عملاً لوگ اس کی ہستی کو فرضی سمجھتے تھے، اور وہ اصل چیز حکومت کو تصور کرتے تھے، کیونکہ یہ اُن کے سامنے پیکرِ محسوس کی شکل میں جلوہ گر تھی، وہ اُن کی زندگیوں پر نہایت گہرے طور پر اثر انداز تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ ریاست کے بارے میں بھی وہی رائے قائم کر لیتے جو حکومت کے بارے میں رکھتے تھے، مگر پے نا (JENA) کے میدان میں پرشیا کی شکست اور اس کے بعد نپولین کے جرمنی پر بالکل حاوی ہو جانے کا سیاست اور سیاسی ذہنیت پر وہ اثر پڑا جو یورپ کے تمام فلاسفہ کی قیل و قال اور انقلاب کی ساری کشمکش کو نصیب نہ ہوا تھا۔ قومیت کے جذبے نے صرف جرمنی کو نپولین کے ظلم سے آزاد نہیں کیا بلکہ معاشرے میں ربط اور سیاسی فلسفے میں معنی پیدا کرنے کا ایک بہت اچھا ذریعہ فراہم کر دیا۔ لہٰل جرمنی کو اتحاد و ایثار پر آمادہ اسی عقیدے نے کیا کہ وہ ایک قوم ہیں، ان کی ایک خاص تہذیب ہے، اس تہذیب کی حفاظت کرنا اور قوم کی عزت قائم رکھنا اُن کا سب سے بڑا

فرض ہے اور یہ فرض صرف ریاست سرانجام دے سکتی ہے۔ اسی طرح قومیت کے احساس اور تہذیب کے قدر دانوں نے جرمنی قوم کو ریاست کے استحکام اور اس کی قوت اور اقتدار کو حتی الامکان بڑھانے کی مصلحت سجھائی۔ رفتہ رفتہ جرمنوں کی ایک خاصی بڑی جماعت کو پروشیا کی سلطنت سے وہ گہرا روحانی، اخلاقی اور تہذیبی تعلق ہو گیا جو فلسفے کی رو سے ایک سچے شہری کو اپنی ریاست سے ہونا چاہیے، اور ریاست کے عینی تصور نے، جو زیادہ سے زیادہ ایک فلسفیانہ حقیقت تھا، ایک واقعی ریاست کی شکل اختیار کر لی۔[1]

یہی وہ دور تھا جس میں انسان نے بھاپ کے دیو کو مسخر کر کے اس سے بڑی بڑی مشینیں چلوانی شروع کیں۔ اس سے پیداوار میں حیرت انگیز ترقی ہوئی۔ مگر یہ "ترقی" سراپا رحمت نہ تھی بلکہ اس نے مختلف قوموں اور ملکوں کے سامنے بے شمار پیچیدہ مسائل کھڑے کر دیئے۔ وہ قومیں جو اس صنعتی انقلاب کی دوڑ میں آگے تھیں وہ کچھ مدت کے لیے تو دنیا کی دولت بے خطر سمیٹتی رہیں، مگر جلد ہی ان کے حریف پیدا ہو گئے اور اس میدان میں مسابقت کا دور شروع ہوا۔ ظاہر بات ہے کہ شکار گاہوں کی تلاش کچھ آسان کام نہ تھا، اس کے لیے بڑے بڑے معرکے ہوئے تب کہیں جا کر طاقتور شکاریوں کو اطمینان اور چین سے شکار کرنے کا موقع ملا۔

یہ مہمات اسی صورت میں سر کی جا سکتی تھیں جب ملک کے اندر اتحاد اور یک جہتی ہو، جب ایک ہی جذبہ ساری قوم کو متحرک کر دے، اور ملک کے سارے باشندے اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو بلا چون و چرا ان بڑے بڑے اور کہنہ مشق "شکاریوں" کے حوالے کر دیں۔ اسی جذبے نے ملک میں فسطائی رجحانات کو تقویت دی، اور پوری کی پوری قوم میں بلا سوچے سمجھے ایک فرد یا گروہ کی پیروی میں دوسروں پر ٹوٹ پڑیں۔

دوسری طرف جب کمزور اقوام نے یہ دیکھا کہ اُن کی زندگی پر آ بنی ہے تو انہوں نے بھی اپنے آپ کو بچانے کے لیے اپنے گرد قومیت کی دیواریں کھڑی کر دیں، اور ان کے پیچھے پناہ ڈھونڈی۔ بیرونی خطرات نے ان سب کو

---

[1] تاریخ فلسفۂ سیاسیات از محمد مجیب

ایک مرکز پر جمع کر دیا اور وہ متحد ہو کر دشمن کے خلاف صف آرا ہوئیں۔

انسانی ذہن کبھی خلا میں کام نہیں کرتا۔ اس کے لیے کوئی نہ کوئی اساس ضرور ہونی چاہیے۔ اُسے اگر ایجابی محرکات مہیا نہ ہوں تو وہ سلبی جذبوں سے کام لیتا ہے۔ اس کا واضح ثبوت ہمیں قومی ریاست میں ملتا ہے۔ کلیسا اور مذہب کی شکست کے بعد مغربی ذہن نے کچھ اس قسم کے محرکات کو جنم دینے کا عزم کیا جن سے اُس کی زندگی کا عمل جاری رہ سکے۔ اسی کے نتیجہ میں حق پرستی کو چھوڑ کر قومیت پرستی کو ایک دین کی حیثیت سے اختیار کیا گیا۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قومیت ایک قسم کا نفسیاتی احساس ہے جسے نہایت ہی غلط اور بھونڈے طریقے سے روحانی احساس کی جگہ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ پھر جس طرح دین انسان کے اس روحانی جذبہ کو ایک محسوس شکل میں منتشکل کرتا ہے، اسی طرح ریاست پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی ہے کہ وہ احساس قومی کو عملی جامہ پہنائے۔ اس نقطۂ نظر سے مملکت اب ایک ایسی تنظیم بن گئی ہے جو ایک طرف تو قوم کے ارادہ اور منشا کا مظہر ہوتی ہے اور دوسری طرف اُس کی اجتماعی زندگی کی سب سے بڑی محرک۔ مملکتی نظم ونسق کی وحدت اور معاشی مفاد کی یکسانیت سے قومیت کے جذبہ کو نشوونما پانے کا پورا موقع ملتا ہے جسے دوسری اقوام سے معاشی مقابلہ کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح یہ جذبہ ایجابی اور سلبی طور پر موجودہ دَور کے قوم پرست انسان کو سرگرم عمل کر رہا ہے۔ اس کی حیثیت آج وہی ہے جو آج سے چند سو سال پہلے دین، اخلاق کی تھی، آج انسان اس نئے بت کے سامنے اسی طرح سربسجود ہیں جس طرح کہ کبھی وہ ایک بلند و بالا ہستی کے سامنے جھکتے تھے ؎

فکرِ انساں بت پرستے، بت گرے

ہر زماں در جستجوئے پیکرے

باز طرحِ آذری انداخت است

تازہ تر پروردگارے ساخت است

کاید از خوں ریختن اندر طرب

نام او رنگ است وہم ملک و نسب